© rasailojaraid.com

اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور اس کے ساتھ آپ نے اپنے علمی اور تحقیقی معیار کو نیچے نہیں گرنے دیا۔ اس لحاظ سے سید مودودی مرحوم کا شمار ان چند اہل قلم میں ہوتا ہے جو اپنی تصانیف کی کثرت اور معیار کی یکسانی دونوں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید صاحب کی آخری تصنیف سیرت سرور عالمؐ ہے جو دو جلدوں (اکتوبر ۱۹۷۸ء) میں ہے اور دونوں جلدیں مکی زندگی پر مشتمل ہیں۔ سید صاحب نے اپنی اس کتاب کے بارے میں ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ء کو طلبہ کی طرف سے منعقد ہونے والی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> اسی مطالعہ و تحقیق کے نتیجے میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دین پوری طرح لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک براہ راست قرآن سے اسے نہ سمجھا جائے۔ میں نے قرآن مجید کی تفسیر سیرت پاک سے اس کا ربط جوڑتے اور جگہ جگہ آیتوں اور سورتوں کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ نزول قرآن اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے ہیں۔ اسی طرح میں نے جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات اور احکام کی تشریح میں معتبر احادیث نقل کی ہیں جن سے احادیث اور قرآن کا تعلّق بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور اس غلطی فہمی کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ حدیث کے بغیر بھی قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ پڑھنے والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے بکثرت ارشادات واحکام کو آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

سید مودودی کی ہمہ گیر شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی۔ آپ بہ یک وقت مفسر بھی تھے اور مفکر بھی، مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی، نقاد بھی تھے اور مبصر بھی، مقرر بھی تھے اور مبلغ بھی، دانش ور بھی تھے اور ادیب بھی، مصنف بھی تھے اور صحافی بھی، سیاست دان بھی تھے اور جید عالم دین بھی۔ ذیل میں ان کی ہمہ گیر شخصیت پر ایک اجمالی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے:

۱- اسلام ایک انسان میں کس قدر عظیم الشان انقلاب برپا کرتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں دور کر دیتا ہے، اس کی ایک مثال اس زمانے میں ہمارے سامنے مولانا مودودیؒ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- اس میں رائی برابر مبالغہ نہیں ہے کہ سید مودودی مرحوم نے دین اسلام کی خاطر بہت سی مصیبتیں مول لے کر اپنے راحت و آرام کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس شخص نے بیمار رہ کر وہ کام کیا جو بہت سے لوگ تندرست اور صحت مند رہ کر نہیں کر سکتے۔

۳- جو شخص سید مرحوم کی تحریروں کو پڑھے گا اسے معلوم ہوگا کہ ان کے ایمان میں کس قدر قوت تھی اور ان کا ادب کس قدر بلند اور شستہ تھا۔ ان کی تحریر ایک فنی انداز میں تہذیب و ادب کی تحریر تھی، جس سے ان کے گہرے مطالعے، باریک بینی، دینی تڑپ، رقت قلب اور زندگی کے وجدان کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴- سید مودودیؒ قدرت کی طرف سے بڑا اچھا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے روشن فکر، دردمند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی قوی تھا۔

۵- سید مودودیؒ ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے تھے، جنھوں نے زبان کو صحیح طریقے پر استعمال کیا۔ اپنے فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں سے ان کے فن کو جلا بخشی۔ قدیم ماخذ کے گہرے مطالعے اور جدید لٹریچر سے براہ راست استفادہ کیا۔ ایک مناسب اور معقول طرز میں ادبیت کو ڈھال دیا۔

۶- سید مودودیؒ اوقات کے بڑے منضبط تھے۔ وہ اصولی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ نظم و ضبط پر اتنا زور دیتے تھے کہ جیسے زندگی کو مشن بنا دینا چاہتے تھے۔ اگر سید صاحب اوقات میں ضبط و نظم کا اتنا اہتمام نہ کرتے تو وہ علم و ادب کی خدمت نہ کر سکتے تھے۔ بے قاعدگی اور بدنظمی سے ان کو سخت نفرت تھی۔

۷- سید مودودیؒ ٹھوس مطالعے کے عادی تھے۔ عربی ادب و انشاء، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، اشتراکیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ، ان کے خاص موضوع تھے۔ اس لیے ان فنون میں ان کا مطالعہ بہت ٹھوس اور تنقیدی تھا۔

۸- سید مودودیؒ عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ علوم اسلامیہ میں تبحر علمی کے علاوہ سیاست، فلسفہ، سائنس اور جغرافیہ وغیرہ سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیمتی یادوں کا محور

پروفیسر عنایت علی خان ○

تقسیم ہند کے نتیجے میں پاکستان آ کر حیدر آباد (سندھ) میں قیام کیا' تو میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے تین باتوں میں مختلف تھا: پہلی چیز ہمہ وقت سر پر رہنے والی سیاہ رام پوری ٹوپی' دوسری پانچ وقت مسجد کی حاضری' اور تیسری ناشائستہ ہنسی مذاق سے خود کو نشانۂ مذاق بنوا دینے سے شدید اجتناب۔ غالباً انھی علامات کی بنا پر بڑے بھائی کے ایک ہم عمر دوست نے مجھے ''مولانا مودودی'' کا خطاب دیا ہوا تھا۔ میں تو کیا وہ خود بھی مولانا کی شخصیت اور جماعت اسلامی سے کہیں ایک عرصے بعد متعارف ہوئے' لیکن یہ واقعہ اس بات کی بہرحال دلیل ہے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کا نام ایک دین دار شخصیت کی حیثیت سے معروف ہو چکا تھا۔

مولانا مرحوم و مغفور سے پہلا باقاعدہ تعارف اسلامی جمعیت طلبہ کی رفاقت کے نتیجے میں' کچھ جمعیت کے سابقون الاولون اور کچھ ان کتابچوں سے ہوا' جو جمعیت کی رفاقت کے نصاب میں پڑھنے کا موقع ملا۔ لیکن مولانا کی عظمت کا نقش دل پر اس وقت مرتسم ہوا' جب مولانا کو قادیانی مسئلے کے حوالے سے پھانسی کی سزا سنائی گئی اور مولانا نے معافی مانگ کر رہا ہو جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس واقعے پر احتجاجی جلوس میں شرکت بھی کی۔ ان امور نے تعلّق کو عقیدت میں تبدیل کر دیا اور دل میں مولانا سے ملنے کی خواہش بیدار ہوئی۔

پھر اپنے عربی کے استاد نسیم اللہ صاحب اور مولانا وصی مظہر ندوی صاحب جیسے بزرگوں

○ اُردو کے معروف شاعر' مجموعہ کلام عنایات' حیدر آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مولانا مرحوم کی ذہانت و بصیرت، اخلاص اور للٰہیت کے واقعات سن سن کر اس آتشِ شوق میں اور اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ جمعیت میں شمولیت کے ۱۰، ۱۱ سال بعد اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں لاہور جانا ہوا تو وہاں ایک سسرالی عزیز کے ہاں قیام کے دوران اخبار میں پڑھا کہ مولانا مودودیؒ فلاں مسجد میں درس قرآن دیں گے۔ اس موقعے کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر پتا پوچھتا ہوا مذکورہ مسجد جا پہنچا۔ مولانا، مسجد کے برآمدے میں تشریف فرما تھے، برآمدے اور صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکے تھے۔ دیر سے آنے والوں کے ساتھ دوسری منزل کی گیلری میں جگہ ملی، جہاں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے آواز تو صاف آ رہی تھی، لیکن مولانا پر نظر کھڑے ہونے پر ہی پڑتی تھی۔ مستقل کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ میں تھوڑے وقفے سے اٹھ کر مولانا کو دیکھتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ موضوعِ تقریر ''دعا کی اہمیّت'' تھا۔ مولانا کا ٹھیرا ہوا پُروقار لہجہ اور تکلف سے پاک اندازِ بیان، دل میں گھر کر رہا تھا۔ جتنی بار اٹھ کر مولانا کو دیکھتا ہر بار فرطِ مسرت سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ درس کے اختتام پر ہجوم کے سبب ہاتھ ملانے کی خواہش تشنۂ تکمیل رہی، لیکن مولانا کو دیکھنے اور سننے کا نشہ تا دیر قائم رہا۔

اس واقعے کے کئی سال بعد ۱۹۷۰ء کے قومی و صوبائی انتخابات کا اعلان ہوا۔ مجھے ایک سال قبل جماعت کے رفقا کیڈٹ کالج پٹارو [سندھ] سے تعمیر نو اسکول، سکھر لے جا چکے تھے۔ کہا یہ گیا تھا کہ تعمیر نو کے ہیڈ ماسٹر حافظ وحید اللہ، تنظیم اساتذہ کی تشکیل کے سلسلے میں سکھر سے لاہور منتقل ہو گئے ہیں اور مولانا کی خواہش ہے کہ میں ان کی جگہ تعمیر نو اسکول سنبھالوں۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے لیے نامزدگیاں شروع ہوئیں تو حیدرآباد جماعت نے صوبائی اسمبلی کے ایک حلقے سے میرا نام طے کیا۔

انتخابی مہم کے دوران میرے ایک شاگرد اپنے پیپلز پارٹی سے منسلک دوستوں کی ناراضی کی قیمت پر میرا سیاسی کام کر رہے تھے، اور اس انداز سے کر رہے تھے کہ اپنے ساتھیوں کو کام کا ہدف پورا کرنے پر تفریح کے لیے لے جاتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ انتخاب کا نتیجہ کچھ بھی نکلے، آپ مجھے مولانا مودودیؒ سے ملاقات کرانے لاہور لے کر جائیں گے۔ ان دنوں مولانا مرحوم و مغفور کی صحت اس حد تک خراب تھی کہ معالجین نے انتخابی مہم میں حصہ لینے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا، اور مولانا نے یہ پابندی اپنی شدید خواہش کے علی الرغم قبول کر رکھی تھی۔ ان نوجوان کا کہنا تھا: ''مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سفر کرنے سے قاصر ہیں' اور میں ان سے بالمشافہہ ملنا چاہتا ہوں۔ اس لیے وعدہ کریں کہ انتخابی مہم کے بعد لاہور چلیں گے اور مجھے مولانا سے ملوائیں گے''۔

اس وعدے کی تکمیل نے مولانا مرحوم ومغفور سے بالمشافہہ ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ لاہور پہنچ کر میں نے چودھری رحمت الٰہی صاحب [سیکرٹیری جنرل جماعت اسلامی پاکستان] سے اپنا اور نوجوان کا تعارف کرایا' اور ان کی خواہش کی اس شدت کا ذکر کیا کہ وہ مجھے اپنے خرچ پر لاہور لائے ہیں اور اب ہوٹل میں مقیم ہیں۔ چودھری صاحب نے ذرا تکلف وجرح کے بعد ہماری درخواست منظور کر لی۔ پھر دونوں سراپا اشتیاق مولانا کے کمرۂ مطالعہ وملاقات میں داخل ہوئے۔ مولانا نے کمال شفقت سے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ کیا۔ اپنی آئیڈیل شخصیت سے اس قربت کا احساس اور مولانا کے ہاتھ کے لمس نے کچھ دیر کے لیے تو ہم دونوں کو مبہوت رکھا۔ نوجوان تو آخر تک شخصیت کے محبوبانہ طلسم سے آزاد نہ ہو سکے۔ میں نے مختصراً اپنا تعارف کرایا تو مولانا نے کیڈٹ کالج' پٹارو سے سکھر اور سکھر سے نوکری چھڑوا کر حیدر آباد بلوانے پر معترضانہ انداز اور تشویش بھرے لہجے میں صرف: ''اچھا!'' کہا اور پھر دریافت فرمایا: ''اب آپ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''فی الحال تو بے کار ہوں''۔ مولانا نے زبان سے کچھ نہیں کہا' لیکن ان کے چہرے پر جو تشویش کے آثار نظر آئے' انھیں مجھ سے زیادہ میرے ساتھی نے نوٹ کیا۔

پھر میں نے اس نوجوان کا تعارف کرایا: ''یوں تو یہ ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بزرگوں سے پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری ہے' لیکن ان کے بزرگ کھاؤ پیر نہیں بلکہ مریدوں کی ہر طرح خبرگیری کرتے ہیں اور یہ خود انگریزی میں ایم اے کر رہے ہیں''۔ مولانا نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا: ''جماعت اسلامی کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے' جو کہیں کہ ہماری ذہانت دین کی راہ میں کھپا دیجیے''۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے تعارف کے بعد' میرے ساتھ جو شاگرد شدید چاہت سے مولانا سے ملنے آئے ہیں' وہ خود مولانا سے ہم کلام ہوں۔ لیکن ان پر نظر پڑی تو انھیں اسی طرح مبہوت پایا۔ اب میں تو محض ان کی خواہش پر آیا تھا' خالی الذہن اور خود وہ بھی خاموش بیٹھے تھے۔ مولانا گویا ہماری جانب سے کسی سوال کے منتظر تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند ثانیے کی خاموشی کی بعد میرے ذہن میں ایک خیال آیا، جس کے اظہار کے ذریعے یہ سلسلۂ سکوت توڑا۔ میں نے عرض کیا: میرے شیعہ دوست ہیں جو پروفیسر کرار حسین صاحب اور پروفیسر حسن عسکری کے شاگرد رہے ہیں۔ انھوں نے ایک دن مجھے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ مذکورہ دو اساتذہ کی خدمت میں حاضر تھے، اور وہ دونوں اسلام کے حوالے سے کسی نظری بحث میں مصروف تھے۔ میں نے نہایت ادب سے یہ سوال کیا کہ جناب یہ نظری بحث اپنی جگہ، لیکن یہ نوجوان نسل جو اسلام سے دور ہوتی جارہی ہے اس بارے میں بھی آپ حضرات نے کچھ سوچا؟ اس پر پروفیسر حسن عسکری نے کہا: ''نادر صاحب، جب آپ شاگرد تھے تو کوئی بھی شخص بال بڑھائے مذہب پر تنقید کرنے کھڑا ہو جاتا اور کمیونزم کے بارے میں دلائل دے کر مرعوب و متاثر کرسکتا تھا، لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ آج کے طالب علم خود کو فخر سے مسلمان کہتے ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ نوجوان بھرپور استدلال سے ایسے لوگوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں''۔ عسکری صاحب نے مزید کہا: ''مولانا مودودی نے اگر اپنی زندگی میں اور کوئی کام بھی نہ کیا ہوتا، صرف اسلامی جمعیت طلبہ ہی کی تشکیل کی ہوتی تو ان کی بخشش کے لیے یہی ایک چیز کافی تھی''۔

میں نے یہ واقعہ اس تمہید کے ساتھ گوش گزار کیا: ''میں منہ پر تعریف نہیں کر رہا، بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ واقعہ سنا رہا ہوں''۔ میں نے دیکھا، مولانا مودودی مرحوم و مغفور کا چہرہ کسی قسم کے جذبۂ فخر سے بیگانہ تھا۔ پھر نہایت سادہ لہجے میں مولانا نے یہ فرمایا: ''ہاں، یہ بات بعض مواقع پر اے کے بروہی صاحب اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بھی کہی ہے''۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد فرمایا: ''تقسیم ملک کے بعد بعض طالب علم میرے پاس آئے اور کہا ہمیں جماعت اسلامی میں شامل کرلیں، تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی اور میں نے انھیں مشورہ دیا کہ دعوت دین کا جو کام جماعت اسلامی عوام میں کر رہی ہے وہی کام وہ آزادانہ طور پر طالب علموں کے دائرے میں رہ کر کریں''۔ پھر مربیانہ انداز میں فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ بندے سے کوئی خدمت لے تو بندے کو اس پر شکر کرنا چاہیے کہ یہ خدمت اس سے لی گئی۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں نے یہ کام کیا ہے''۔

اب مولانا کا قیمتی وقت لینے کا کیا جواز تھا؟ لیکن اپنے شاگرد کے شوقِ ملاقات کی تسکین ہی کی خاطر ایک عام سا سوال کر ڈالا: ''مولانا! یہ ہم جماعت کے لوگوں نے ایک خاص وضع کی چھوٹی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

داڑھی رکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اور جسے ہمارا ٹریڈ مارک سمجھ لیا گیا ہے‘ اس کی کیا وجہ ہے؟“

مولانا نے بزرگانہ بے تکلفی سے جواب دیا: ”دیکھیے‘ داڑھی کے بارے میں یہ بات نظر میں رکھیے کہ داڑھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مجبُوری کی اور دوسری اختیار کی۔ مجبُوری کی داڑھی وہ ہے جو نہ رکھی جائے تو مسجد کی موذنی نہ ملے‘ مدرسے کا وظیفہ نہ ملے‘ یہ داڑھی تو آپ جتنی لمبی چاہیں رکھوالیں۔ لیکن جہاں تک اختیار کی داڑھی کا تعلق ہے‘ جس کے لیے کوئی مجبُور نہیں کر رہا اور محض دین داری کی وجہ سے رکھی جارہی ہے‘ وہ ایک قسم کا جہاد ہے۔ ایسی داڑھی رکھنے والوں کو کالجوں اور یونی ورسٹیوں اور دفتروں میں فقرے بازی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میرے علم میں ایسے واقعات بھی آئے ہیں کہ کسی نوجوان نے داڑھی رکھ لی تو اس کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اس لیے میرے نزدیک تو ان لوگوں کی یہ چھوٹی داڑھی بھی جہاد سے کم نہیں ہے۔ اب ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ نہیں اتنی رکھو‘ یہ نامناسب ہے“۔

میں چونکہ داڑھی کی شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا کا موقف پڑھ چکا تھا اور یہ مقولہ بھی سن چکا تھا کہ: ”اسلام میں داڑھی ہے داڑھی میں اسلام نہیں“، نیز یہ کہ ”داڑھی پہلے اندر جڑ پکڑ کر باہر آئے تو داڑھی معتبر ہوتی ہے ورنہ سکھوں کی داڑھی تو مسلمانوں سے کہیں بڑی ہوتی ہے“۔

یہ بات بھی پوری ہوئی‘ لیکن لذت کلام ہی کے لیے سلسلۂ کلام جاری رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے ایک اور سوال پیش کر دیا: ”مولانا‘ آپ نے صحیح فرمایا۔ میں خود اس قسم کے طنز کا شکار رہا ہوں۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ حلقۂ احباب کے حلق سے داڑھی اتر جاتی ہے بلکہ میرے بعض احباب نے تو یہ بھی کہا کہ یار! اب اسے کٹوانا مت۔ جب طنز و تشنیع کا مرحلہ گزر جائے تو پھر داڑھی بڑھانے میں کیا قباحت ہے؟“ (میرے ذہن میں خود مولانا کا طرزِ عمل تھا)۔

مولانا نے شگفتگی سے فرمایا: ”ایک یہ بات بھی ہے کہ جہاں یہ لمبی داڑھی ناکام رہتی ہے‘ وہاں یہ چھوٹی کام نکال لے جاتی ہے“۔ اس وقت تو یہ جواب سن کر ہنس کر رہ گیا لیکن بعد میں اس بلیغ جملے پر غور کیا تو اس کی صداقت واضح ہوتی گئی۔

میں نے اپنے ساتھی کو کنکھیوں سے دیکھا تو وہ اسی طرح نظریں نیچے کیے مؤدب بیٹھے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ان کی تسکینِ خاطر کے لیے اتنا وقت لے لینا ہی کافی‘ بلکہ بہت زیادہ تھا۔ اب ہمیں مولانا کا قیمتی وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ مولانا سے اجازت چاہی‘ مولانا نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ازراہ شفقت دوبارہ مصافحہ فرمایا، اور ہم دونوں اس قیمتی لمحۂ حیات کے نشے میں سرشار باہر آ گئے۔

میرا خیال تھا کہ ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جانے پر شاگرد صاحب خوش اور میرے ممنون ہوں گے، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ دروازے سے باہر آتے ہی بولے: ''سر آپ نے اپنی بیکاری کا تذکرہ مولانا سے کیوں کیا؟ آپ نے مولانا کو پریشان کر دیا''--- ''وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ بولے: ''آپ کو اپنی بے کاری کا تذکرہ مولانا سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے دیکھا تھا، مولانا آپ کی بات سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ سر، اچھا نہیں کیا آپ نے۔ مولانا کو بڑے بڑے مسائل سوچنے پڑتے ہیں۔ آپ نے ان کے ذہن پر ایک اور بوجھ ڈال دیا''۔ میں نے کہا: ''چلیے، ابھی تو ہم لاہور میں ہیں نا۔ کل عصری نشست میں، میں اطمینان دلا دوں گا کہ حیدرآباد میں غزالی کالج میں جگہ نکلنے والی ہے، وہاں مصروف ہو جاؤں گا''۔

دوسرے روز اسی مقصد سے عصری نشست میں شریک ہوئے۔ محفل کا واحد موضوع [دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں] جماعت کے امیدواروں کی ناکامی تھا اور اس ضمن میں جمعیت علمائے پاکستان کے معاندانہ پروپیگنڈے کا بطورخاص ذکر تھا۔ ایک صاحب نے کہا: ''مولانا! یہ علمائے پاکستان والے کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی ۲۵، ۳۰ سال سے کام رہی ہے۔ ہم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کے ہیں، لیکن ہم نے جماعت اسلامی کو ایسے شکست دی ہے جیسے کوئی بچہ کسی پہلوان کو پچھاڑ دے''۔

مولانا نے فرمایا: ''یہ نادان لوگ ہمیں اپنا حریف سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ ہم ان کی فصیل تھے۔ دین کے خلاف اب جو طوفان آنے والا ہے (اشارہ پیپلز پارٹی کے اقتدار کی طرف تھا) اُسے یہ نہیں روک سکیں گے۔ ہم شاید روک لیتے''۔ پھر ذرا توقف کے بعد فرمایا: ''سیاسی جماعتوں کا کام عوام کو سیاسی طور پر ایجوکیٹ [educate، یعنی رہنمائی] کرنا ہوتا ہے۔ اس الیکشن میں سیاسی جماعتوں نے عوام کو ڈس ایجوکیٹ [diseducate، یعنی گمراہ] کیا ہے۔ کسی نے روٹی کے نام پر ایکسپلائیٹ [exploit- استحصال] کیا ہے، کسی نے روضے کے نام پر''۔

ایک صاحب نے کہا: ''جی ہاں مولانا، کہا یہ جاتا تھا کہ دیکھ جنت کی چابی کو اور رسولؐ اللہ کے روضے کو (مراد تھی وہ جھنڈا جس پر گنبد خضرا بنا ہوا تھا) ووٹ دینا ہے، باوضو آنا ورنہ ووٹ قبول نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگا''۔ ایک اور صاحب نے گرہ لگائی: ''جی مولانا، یہ کہتے تھے کہ جماعت اسلامی والے کہتے ہیں کہ ملک میں سوشلزم آ گیا تو روسی ترکستان کی طرح مساجد میں تالے پڑ جائیں گے۔ پڑ جائیں تالے' ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں پوری زمین ہمارے لیے مسجد بنا دی گئی ہے' ہم جہاں چاہیں گے سجدہ کرلیں گے۔ لیکن یہ وہابی ہمارے بزرگوں کے مقبرے ڈھا دیں گے تو وہ ہم کہاں سے لائیں گے''۔ ایک اور صاحب نے لَے میں لَے ملائی: ''مولانا' شبرات کا موقع تھا' ان کے مقررین کہتے تھے: لوگو! اس سال اپنے بزرگوں کی روحوں کو ایصال ثواب کردو۔ اگر اگلے سال یہ وہابی آ گئے تو تمھارے بزرگ قبروں میں ایصال ثواب کو ترسیں گے''۔

''جی ہاں!'' مولانا نے تینوں حضرات کے بیان پر مسکرا کر پنجابی کا صرف ایک فقرہ فرمایا: ''ہور چوپو''۔ اب جن لوگوں نے سکھوں کا وہ لطیفہ سنا ہوا تھا جو اس جملے پر ختم ہوتا تھا' وہ اس فقرے سے ایسے محظوظ ہوئے کہ ذرا دیر کے لیے تشویش و اضطراب کی فضا خوشگوار ہوگئی۔ میں نے سوچا اگر اس وقت کسی اور سیاسی پارٹی کا سربراہ مولانا کی جگہ بیٹھا ہوتا تو کیا وہ بھی ایسی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرسکتا تھا؟ کیا دل کی یہ سکینت اللہ تعالیٰ کی خاص دین نہیں۔

جی نے چاہا کہ میں بھی کسی بہانے گفتگو میں شرکت کروں' چنانچہ میں نے بھی ایک سوال داغ دیا: ''مولانا! اگر [صدر جنرل] یحییٰ خان کے دیے ہوئے پلان پر عمل کیا گیا تو کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوسکے گا؟'' مولانا نے اب تک کے اپنے انداز گفتگو کے برعکس ذرا تیز لہجے میں فرمایا: یحییٰ خان عوام کو کس برتے پر اعتماد میں لیں گے' ان کے پاس اب رہا کیا ہے؟ اب تو آپ انتظار کیجیے اور یہ دیکھیے کہ یحییٰ خان صاحب نے جو گڑھا کھودا ہے اس میں وہ خود پہلے گرتے ہیں یا قوم گرتی ہے''۔ مولانا کی یہ تشویش کس قدر مبنی بر حقیقت تھی۔ اس کا ثبوت ذوالفقار علی بھٹو کی ہوس اقتدار کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور وہاں خون ریزی اور بھارت کی یلغار کی شکل میں ملا۔

عصری نشست سے اٹھ کر مولانا اپنے کمرے میں جانے لگے تو میں نے آگے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا۔ مولانا نے فرمایا: ''اچھا' آپ لوگ ابھی لاہور ہی میں ہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''مولانا' یہ میرے شاگرد مجھے ڈانٹ رہے ہیں کہ تم نے کل اپنی بے کاری و بے روزگاری کا ذکر کر کے مولانا کو پریشان کردیا ہے' تو عرض ہے کہ ان شاء اللہ چند روز میں مجھے غزالی کالج میں

© rasailojaraid.com